1

مبدأ حرکت اور فلسفۂ خودی

اقبال کے اشعار و افکار میں

جمہوریہ تیونسیہ کے شہر سوسہ میں ۱۴- مئی سنہ ۱۹۶۵ءکو سفارتخانۂ پاکستان کے زیر اہتمام یوم اقبال منایا گیا - اقبال کے پیغام کی اہمیت کا احساس ساری دنیائے اسلام کو ہے مگر تیونس اس خصوص میں سب پر سبقت لے گیا ہے - وہاں مطالعۂ اقبال تمام گریجوئیٹ طلباء کے لئے لازمی مضمون کی حیثیت سے نصاب میں داخل ہے - خود ثانوی مدارس کے اکثر ذہین طلباء بھی اقبال شناس ہیں - چنانچہ ان کے حالات زندگی، افکار اور پیغام سے خاصی واقفیت رکھتے ہیں - ان امور کے پیش نظر سفارتخانہ پاکستان نے اپنی یہ مستقل پالیسی رکھی ہے کہ یوم اقبال کا باقاعدگی سے تیونس کے مختلف شہروں میں باری باری اہتمام کیا جائے تاکہ وہاں کے عام باشندوں میں بھی اقبال کے فکر و کلام کی ہمہ گیر اشاعت ہو سکے -

شہر سوسہ کے یوم اقبال کی تقریب بلدیہ کے ہال میں منعقد ہوئی - مجمع کا یہ عالم تھا کہ پورا ایوان بلدیہ بھرا ہوا تھا - اجلاس کی صدارت کے فرائض جناب عبدالغیور سفیر پاکستان نے انجام دئیے - جناب احمد نورالدین وزیر تعمیرات حکومت تیونس مہمان خصوصی تھے - انکے علاوہ رئیس بلدیہ اور سوسہ کے گورنر بھی جلسے میں موجود تھے -

مندرجہ ذیل مقالہ پروفیسر احمد خالد نے اس جلسہ میں پڑھا - حاضرین نے بہت پسند کیا - ایک امریکی پروفیسر بھی حاضرین میں تھے - انہوں نے واپس جاکر، جب اپنے وطن سے احمد خالد کو خط لکھا تو اس مقالہ کا بطور خاص ذکر ان الفاظ میں کیا :

"اجازت دیجئے کہ میں آپ کو آپ کے اس مقالہ پر مبارکباد پیش کروں - اقبال ہمارے ان معاصروں میں سے ہیں جن کے افکار سے ہر شخص یا کم از کم اسلامی دنیا کے ہر فرد کو واقف ہونا چاہئے - مجھے مسرت ہے کہ آپ کی کوشش سے شمالی افریقہ کے لوگ ان سے روشناس ہوئے - اگرچہ اقبال پاکستان بننے سے پہلے فوت ہوگئے مگر پاکستان کا وجود اقبال کی ایک شاندار یادگار ہے - علاوہ ازیں ان کی ہستی ایک اور وجہ سے بھی اہم ہے - انہوں نے اسلامی طرز حیات کے تقاضوں کو ہم عصر افکار سے ہم آہنگ کیا اور اس آہنگ کی تخلیق میں نہ تو انہوں نے حقیقت سے فرار کی صورت اختیار کی نہ عہد حاضر سے -

انہوں نے اپنے قارئین کو یہ راستہ دکھایا کہ کس طرح ان حالات سے مطابقت پیدا کی جائے جن میں سے ہو کر انہیں گزرنا ہے "-

یہ مضمون بعد میں مجلۂ "الفکر" (جلد ۱۰ ، شمارہ ۱۰) جولائی ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا جو تیونس کا مشہور مجلہ ثقافیہ ہے - یہ مضمون

پاکستان سفارت خانہ تیونس کی وساطت سے حاصل ہوا۔ ان کے شکریے کے ساتھ اس کا ترجمہ ذیل میں دیا جارہا ہے۔

میرے لئے حقیقتاً یہ ایک بڑا اعزاز ہے کہ تیونس کے سفارت پاکستان نے مجھے مدعو کیا اور اس طرح میرے لئے یہ موقع فراہم کیا کہ محمد اقبال کے ۲۷ ویں یوم وفات پر آپ سے خطاب کروں اور شاعر ملی پاکستان کے اشعار و افکار میں مبدا، حرکت و فلسفہ، خودی کے موضوع پر لب کشائی کروں۔

میں اس دعوت کو قبول کرکے شریک ہوا ہوں تو یہ درحقیقت ان جذبات عشق و تعظیم کا اثر ہے جو اس یگانہ شاعر خلاق اور فلسفی مصلح کے لئے میرے قلب میں موج زن ہیں۔ اقبال سے فرط محبت کی بنا پر ہی میں نے اپنے بچے کا نام اس کے نام پر رکھا ہے، محبت میں کسی کو ملامت نہیں کی جاتی!

فلسفی شاعر اقبال تاریخ ہند کے ایک ایسے تاریک دور میں پیدا ہوئے جب مسلمان پہلی بار غلامی و محکومی کی تلخی سے آشنا ہوئے تھے۔ وہ چھ سو سال کے قریب ہندوؤں کے حکمراں رہنے کے بعد اب انہی کی طرح انگریزوں کے محکوم ہوگئے تھے اور وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کی عزت باقی رہی نہ ان کے قوانین نافذ اور نہ ان کی زبان رائج۔ اس وقت اہل مغرب کا ستارہ عروج پر تھا اور عالم اسلام کے شرق و غرب میں مسلمانوں کی حالت ہندو ایشیا کے مسلمانوں سے بہتر نہیں تھی کیوں کہ گذشتہ چھ صدیوں میں مسلمان پابستہ ہوکر رہ گئے تھے، روشنی بجھ گئی تھی، ان کے دلوں میں روح اسلام مردہ ہوکر رہ گئی تھی، ان کے دین اور فکر میں لچک نہیں رہی تھی اور وہ یہ بھول گئے تھے کہ زندگی ایک ارتقائی تحریک ہے، وہ پیچھے کی طرف لوٹ رہے تھے اور جہل کی تاریکیوں میں کھوگئے تھے۔ پھر وہ استعماری تسلط سے دوچار ہوئے اور انہیں مغربی تمدن کی چمک دمک نے چوندھیا دیا۔ یہ اس عصرنو کا آغاز تھا جس میں عربی اور اسلامی اقوام آج کل زندگی گذار رہی ہیں، مسلمان جہل کی گہری نیند سے جاگ رہے تھے اور اس کاروان تمدن سے جاملنا چاہتے تھے جو گرم رفتاری سے رواں دواں تھا کیوں کہ کاروان تمدن کسی کا انتظار نہیں کیا کرتا۔

دنیائے اسلام کے مشرق و مغرب میں جمال الدین افغانی، ان کے شاگرد شیخ امام محمد عبدہ، رشید رضا، کوکبی اور ابن بادیس جیسے مصلحین مسلمانوں کی برابر راہ نمائی کر رہے تھے۔ ان مصلحین نے اپنی اصلاحی تحریکوں کی بنیاد سب سے پہلے تو اصلاح اخلاق اور احیا دین کو بنایا اور ماضی سے تعلق قطع کئے بغیر نظام اسلام کی تشکیل جدید اور سادہ عقائد کی آمیزش باطل سے اصلاح کو اپنا مطمح نظر بنایا اور کبھی کبھی تو انہوں نے بلاتامل دفاع دین کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی۔ اب ایسی کئی کتابیں مرتب ہوگئی ہیں جن میں ان تحریکوں کی تفصیلات ہیں: مصطفیٰ غیلانی کی کتاب "الاسلام روح المدنیة" (اسلام روح تمدن ہے) اور عباس محمد عقاد کی کتاب "الاسلام فی القرن العشرین" (اسلام بیسویں صدی میں)۔

ان مصلحین نے دین کے دفاع کا محاذ اس لئے سنبھالا کہ استعمال دولت اور انتہا پسند مستشرقین اور متعصب ماہرین سماجیات دشمنان اسلام کا رد کریں جیسے پادری ہنری لامنس (Henri Lamens) لارڈ کرومر اور رینان۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام پر جمود ' رجعت پسندی اور اپنے متبعین کو ترقی سے روکنے کے الزامات لگائے تھے۔ اسلام کی طرف سے دفاعی کوششوں میں بہت سے شعراء نے بھی حصہ لیا۔ ان میں سے ایک معروف الرصافی بھی ہیں۔ فرماتے ہیں:

'' اسلام کے بارے میں دشمن ناروا طور پر کہتے ہیں کہ وہ اپنے متبعین کو ترقی کے راستوں سے روکتا ہے۔ اگر یہ الزام صحیح ہے تو اسلام کے عہد اولین میں اس کے متبعین نے ترقی کیسے کرلی؟ اگر اس دور کے مسلمان کا جرم جہالت ہے تو مسلمان کی جہالت سے اسلام پر کیسے حرف آسکتا ہے؟ حصول علم تو اسلام میں ایک فریضہ ہے اور کیا کبھی کوئی قوم بغیر علم حاصل کئے بھی سربلند ہوتی ہے؟ اسلام نے تو سربلندی و عظمت کے لئے اقوام کی بصیرتوں کو اس وقت بیدار کیا جب وہ اس سے غافل تھیں''۔

مزید فرماتے ہیں:

''ان سے کہدو جنہوں نے اپنے اقتدار کے ذریعہ ہم پر ظلم وجور روا رکھا ہے کہ تم نے گناہوں کی حد کردی ہے ' ذرا ہوش میں آؤ۔ ہم اس وقت سربلند تھے جب تم پست و خوار تھے ، ہم اس وقت تمہارے ساتھ تحقیر سے پیش نہیں آتے تھے۔ ہم نے کسی اختلاف کے وقت تم سے حسن خلق کو ترک نہیں کیا اور بخدا یہی بردباروں اور شرفا کا شعار ہوتا ہے۔ لیکن گردش دھر نے حکومت تمہاری طرف منتقل کردی تو تم نے ہمارے سامنے ایک بڑا اندوہناک و شرمناک منظر پیش کیا۔ اب تم زمانے کی طرف سے مطمئن نہ رہو ، اس کی گردشیں اب بھی ہو رہی ہیں جیسی کہ عاد و جرہم کا نشان مٹانے وقت تھیں''۔

ہند میں جو اصلاحی تحریکیں اٹھیں ان کے بانیوں کے نظریات ان حالات کے بارے میں یکساں تھے جو اس باعزت روبا وقار ملک کے مغلوب و ذلیل بن جانے کا سبب تھے۔ ان مصلحین نے مسلمانوں کی پستی کا سبب عمل پیہم اور جہد مسلسل پر اکسانے والی حرارت ایمانی کے فقدان کو قرار دیا اور متشددانہ سلفی تحریکیں اٹھیں جن کے رہنما رجوع الی القرآن کا مشورہ دیتے تھے لیکن ان تحریکوں میں ایک عقلی رجحان بھی پایا جاتا تھا۔

سید احمد خان دھلی میں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کو ماضی کی گمراہ کن تقلید اور ہر نوع کے ہلاکت خیز تعصب سے گریز کی ضرورت ہے اور انہوں نے محسوس کیا کہ ان حالات میں مسلمانوں کی رہائی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ تعلیم کے ذریعہ ان کے دماغ روشن نہ ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اصلاحی تحریک کو تعلیم کی اشاعت اور اخلاق کی اصلاح پر مرکوز کردیا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب

بھی رہے ۔ انہوں نے ۱۸۷۷ع میں علی گڈھ میں ایک ’’ اسلامی انگریزی مشرق ‘‘ کالج کی بنیاد رکھی ۔ یہ کالج جیسا کہ وہ چاہتے تھے بعد میں یونی ورسٹی بن گیا ۔ اس طرح لکھنؤ میں ندوۃ العلماء ' لکھنؤ کالج اور دارالعلوم ، دھلی اور ڈھاکہ میں دو اسلامی یونی ورسٹیاں ، لاھور میں اسلامیہ کالج اور ھند کے دوسرے بہت سے شہروں میں اسکول اور کالج قائم ہوگئے' یہاں تک کہ ۱۹۴۷ع میں مملکت پاکستان وجود میں آ گئی ۔

سید احمد خان نے نئے معاشرے کی تشکیل میں اصلاح اخلاق کی اھمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے رسالے ’’تہذیب‌الاخلاق‘‘ میں تہذیب اخلاق اور ذھنوں کو ہر نوع کی آمیزش اور کھوٹ سے پاک کرنے کی دعوت دی ۔ یہ رسالہ ایک ادبی محاذ بھی تھا جس میں زندہ ادب کے معاونین آ کر مل گئے تھے ۔

پھر انہی کا اتباع سید امیرعلی نے کیا اور اسلام کا دفاع کیا ۔ انہوں نے اپنی کتاب ’’ اسپرٹ آف اسلام ‘‘ میں جو ۱۸۹۱ میں چھپی تھی بتایا کہ اصلاح سے پہلے حصول علم اور دماغ کو ہر طرح کی بندشوں سے آزاد کرالینا ضروری ہے ۔

لیکن جس شخص نے اس اصلاحی تحریک کی اھمیت کو پورا پورا محسوس کیا اور ملت مسلمہ کے ماضی و حال پر اس مقصد سے نگاہ ڈالی کہ اسباب زوال کا سراغ لگائے جو باریک بیں تھا' اسلام کی تاریخ فکر و حیات پر جس کی گہری نظر تھی اور جو اپنی قوم کے اصل مسائل کو گہرائیوں میں جا کر سمجھنا چاھتا تھا وہ شاعر فلسفی اور مصلح یگانہ محمد اقبال تھا ۔ آج ھم اس کی ۲۷ ویں برسی منانے کے لئے یہاں جمع ھوئے ھیں کیوں کہ ان کا وصال ۶۲ سال کی عمر میں ۲۱- اپریل ۱۹۳۸ کو لاھور میں ھوا تھا ۔

اقبال نے نظام اسلامی پر غور و فکر کیا اور اس کو مستحکم فلسفیانہ بنیادوں پر ان چھ خطبات میں مرتب کیا جو انگریزی زبان میں انہوں نے ھند کی کئی یونی ورسٹیوں کے طلبہ کے سامنے دیئے ۔ پھر ان کو The Reconstruction of Religious Thought in Islam (تجدد التفکیر الدینی فی الاسلام) کے نام سے ایک کتاب میں جمع کیا [۱] ۔

۱- ’’ تجدد التفکیر الدینی فی الاسلام ‘‘ اقبال کے خطبات کے عربی ترجمہ کا نام ہے جسے لجنہ التالیف والترجمتہ والنشر (قاھرہ) نے ۱۹۵۵ میں شائع کیا ' ترجمہ عباس محمود العقاد نے کیا ہے ؛ خطبہ اول کے حواشی مرحوم عبدالعزیز مراغی بک نے اور باقی خطبات کے حواشی دکتور مہدی علام نے تحریر کئے ھیں ۔ مقالہ نگار کے سامنے یہی عربی ترجمہ ہے ۔ صفحات کے حوالہ بھی اسی ترجمے کے ھیں ۔

یہ خطبات چھ نہیں سات ھیں' عربی ترجمے میں بھی ساتوں خطبات ھیں ۔ مگر مترجم نے خطبہ' سوم (الوھیت اور مفہوم عبادت) اور خطبہ' چہارم (انا ' اس کی آزادی و اختیار اور حیات دوام) کو بغیر توضیح و معذرت ایک خطبہ بنادیا اور اس طرح یہ خطبات سات کے بجائے چھ رہ گئے ۔

وہ اساسی عنصر جس نے اقبال کو اس اصلاحی نظریہ اور الہیات کی تجدید کی طرف متوجہ کیا وہ تھی تسخیر فطرت اور مادی و اقتصادی قوتوں پر اقتدار میں مسلمانوں کی پس ماندگی اور پھر اسلام کی روحانی قوت میں ان کی کم زوری۔

اقبال کا خیال تھا کہ یہ پس ماندگی نتیجہ تھی مسلمانوں کے دماغوں پر چھائے ہوئے یونانی فلسفے کے زہر اثر اسلام کی غلط تعبیر و تشریح کا۔ فلسفۂ یونان نے اگرچہ مفکرین اسلام میں فکر و نظر کو وسعت دی تھی مگر در حقیقت جیسا کہ اقبال نے فرمایا فلسفہ نے فہم قرآن میں ان کی نگاہ پر پردے ڈال دیئے تھے۔ اس چیز نے اقبال کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ صحیح فلسفہ کی بنیادوں پر دینی فکر کو استوار کریں اس طرح کہ روح اسلام سے انحراف نہ ہو۔ اس طرح انہوں نے دین و دانش کے درمیان تطبیق کی سعی کی۔

اقبال نے اپنے خطبہ ''روح ثقافت اسلامی'' میں قدیم فلسفہ کی تعلیمات پر یہ تنقید کی ہے کہ وہ اپنے جوہر میں روح قرآن کے مخالف ہے۔ اسلام روحانیت نفس کی توثیق کرتا ہے لیکن وہ عالم مادی کو کھوٹا نہیں بتاتا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وما خلقنا السمٰوات و الارض وما بینھما لٰعبین ، ما خلقنا مما
الا بالحق و لکن اکثرھم لایعلمون (الدخان)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل نہیں بنایا۔ ان کو ہم نے ٹھیک کام پر بنایا، پر بہت سے لوگ نہیں سمجھتے۔

اقبال کی رائے میں اس حقیقت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام عالم مادہ کی پذیرائی کرتا ہے اور اس کی تسخیر کا طریقہ بیان کرتا ہے۔ چنانچہ قدیم مسلمان مفکرین کے لئے جو فلاسفۂ یونان پر یقین رکھتے تھے ناکامی سے کوئی مفر نہ رہا۔ اس لئے جب وہ فلسفۂ یونان کی روشنی میں قرآن فہمی کی طرف متوجہ ہوئے تو ناکام ہوکر غلط فہمیوں میں مبتلا ہوگئے حالانکہ روح قرآن میں حقائق روشن تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وسخر لکم الیل والنھا ر والشمس والقمر و النجوم مسخرات
بامرہ ان فی ذلک لآ یات لقوم یعقلون (النحل)

اور تمہارے لئے رات اور دن اور سورج اور چاند مسخر کئے اور اس کے حکم سے تارے کام میں لگے ہیں۔ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو سمجھ رکھتے ہیں۔

اس کے برعکس فلسفہ یونان مجرد نظری فکر پر اکتفا کرتا ہے اور حقائق کو نظر انداز کردیتا ہے۔ آپ حضرات کے علم میں ہے کہ سقراط نے جو فلاسفہ کا باوا آدم تھا، صرف عالم انسانی کی طرف اپنی تمام توجہ مرکوز کردی اور جیسا کہ اقبال نے بجا طور پر اندازہ کیا تھا سقراط سمجھتا تھا کہ انسان کی حقیقی معرفت صرف انسان پر غور و فکر سے حاصل ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اس کا قول

ہے کہ '' اپنے وجود کو اپنے ہی وجود سے پہچانو '' - عالم نباتات و حشرات و نجوم میں غور و فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں -

افلاطون اپنے استاد سقراط کی تعلیمات کا بڑا پاسدار اور مقلد تھا چنانچہ اس نے ادراک حسی پر رد و قدح کی ہے اس لئے کہ اس کے خیال میں جس سے صرف ظن حاصل ہوتا ہے یقین نہیں - افلاطون نے عالم معقول یا مثل اور عالم محسوس میں امتیاز کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ حق، جمال، دوام اور خیر عالم معقول میں ہیں - رہا عالم محسوس تو وہ بے اصل اور سایوں کی دنیا ہے جیسا کہ اس نے داستان کہف میں اشارہ کیا ہے جو اس کی '' جمہوریت '' کی کتاب ہفتم میں ہے -

یہ ہیں فلسفہ قدیم کی تعلیمات فکر اسلامی کے فلسفہ اشراق کے مقابلہ میں - یہ فلسفہ نظریہ فیض یا فیضان پر مبنی اور افلاطونیت جریدہ سے منقول ہے اور حقیقت کے مقابلہ میں شاعرانہ خیال آرائی سے زیادہ قریب ہے - واقعہ یہ ہے کہ اس نے فکر اسلامی کو جمود سے آشنا کیا اور اس کی ترقی کی راہ میں موازع حائل کئے ہیں اور اس کے اور شریعت کے درمیان کشمکش پیدا کردی ہے - اگرچہ ابو نصر فارابی نے جو معلم ثانی بھی ہے اور اشراقیین کا استاد بھی، تفسیر نبوت، خلق عالم بالاشراق اور سلسلہ عقول مفارقہ کے ذریعہ افلاطون کے نظریہ فیض کو فکر اسلامی میں داخل کرکے حکمت و شریعت کے درمیان تطبیق کی کوشش کی تھی -

فلسفہ فیض نے خصوصاً شروع شروع میں فکر اسلامی کے نئے گوشے کھولنے میں مدد کی تھی جس سے توقع تھی کہ مزید گوشے بھی بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے لیکن اس اثنا میں ابو حامد الغزالی آ گئے جنھوں نے فلسفہ کی رفتار ترقی کو روک دیا اور ان فلاسفہ پر یاوہ گوئی اور لغو بیانی کا حکم لگایا اور کہا کہ عقل وحی کی برابری نہیں کرسکتی اور فلسفہ دین کی طرح نہیں ہوسکتا۔ ابن رشد نے ''تہافۃ التہافہ '' میں غزالی پر جو رد کیا ہے وہ اسلام کی آزاد فکری تاریخ میں ایک آخری کوشش ہے جس کا کوئی اثر دور تاریک میں نہیں رہا - اس کے بعد اب اقبال آئے تاکہ وہ اسلام کے مبدا حرکت کو دوبارہ لوٹائیں جیسا کہ ابن تیمیہ وغیرہ نے ساتویں صدی ہجری میں کیا تھا - اقبال نے ثابت کیا کہ انسان اصل وجود میں ایک تخلیقی اور ترقی پسند قوت ہے جو اپنی رفتار میں ایک حالت وجود سے دوسری طرف ہر قدم پر آگے بڑھتی جاتی ہے اور یہ کہ عالم کوئی جامد قطعی اور مکمل وجود نہیں ہے جو متغیر و متبدل نہ ہوتا ہو بلکہ وہ ایک قوت ہے جس میں مسلسل نمو جاری ہے اور لگاتار تجدد ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اسلام کی طرف اس کی سابقہ زندگی لوٹائی جائے -

اقبال آئے اور اسلام کو اس قید سے آزاد کرایا جس نے صدیوں سے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال رکھی تھیں - اس کے لئے انھوں نے اجتہاد کا دروازہ کھولا جو اسلام کی اساس حرکت ہے - اقبال نے اس کی وضاحت اپنے خطبہ '' تعمیر اسلام میں اصول حرکت '' میں کی ہے، جو ان کی کتاب ''تجدید التفکیر

الدینی فی الاسلام'' کے ۱۶۸ سے ۲۰۹ تک ہے[1] ۔اس مقالہ میں اقبال نے اسلام کو ایک زندہ و تخلیقی قوت تصور کیا ہےجو مسلسل تغیر پذیر زندگی کے دوش بدوش چلتی ہے اور روح زندہ' اسلام کی حرکی و تخلیقی فہم ہے ۔ مطالعہ کرنے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اقبال اور ہنری برگسان مصنف '' تخلیقی ارتقا '' کے اتحاد فکر کا جائزہ لے اس لئے کہ اقبال برگسان ہی سے فیض یاب ہے اور اس سے اقبال نے اپنے فکر کی حرکیت اخذ کی ہے ۔ چنانچہ اقبال اپنے خطبے '' تعمیر اسلام میں اصول حرکت '' میں کہتے ہیں کہ شرع اسلام اجتہاد کے ذریعہ ارتقاء پذیر ہے اس لئے کہ قرآن کائنات کو تغیر پذیر کہتا ہے ۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ فکر ارتقا کا مخالف ہو مگر یہ ارتقا — اقبال کی رائے میں— تغیرمحض کا نام نہیں ہے بلکہ ایسے عناصر پر بھیمشتمل ہے جو قدیم کی حفاظت کا رجحان رکھتے ہیں۔یہیں ہمکو اقبال کی فکر پر ہنری برگساں کا اثر نظر آتا ہے۔

اس فرانسیسی فلسفی کا خیال ہے کہ زمانی رابطہ مضبوط ہوتا ہے اس لئے ہمارا حال اپنی تہوں میں ہمارے ماضی کو بھی لئے ہوئے مستقبل کی تشکیل کر رہا ہے ۔ اس طرح کی بات ولیم جیمس نے بھی کہی ہے کہ فکر مسلسل و متصل حرکت میں ہے ' اس میں نہ تقسیم ہے نہ تفریق ۔ بقول برگسان ماضی ایک ایسی حقیقت ہے جسے بقا' حاصل ہے اور جو حال میں ہوکر استقرار پاتی ہے ۔ اور حال ' خواہ اسکی کوئی من مانی تعریف کی جائے ' اپنے عین ذات میں بلا واسطہ '' سکون محض '' کی حالت ہے ۔

اس بنیاد پر ارتقا اور تجدید کی اساس قدیم پر استوار ہوسکتی ہے نہ کہ اس کے استرداد پر کیونکہ انسان کے ذاتی و تاریخی دوام کا یہی تقاضہ ہے ۔ فرانسیسی فلسفی کے الفاظ میں یہ (وجود تاریخی کا انجرار) استقلال و بقا ہے ۔ یہی ہیگل کا ''معطیہ' حاضرہ'' ہے جو استقلال و بقا کے مترادف ہے ۔

اقبال ہر اس موقف کا مخالف و منکر ہے جو منفی ہو اور جو ارتقائے انسانی کا سدراہ ہو ۔ مثال کے طور پر رومی سے فیض یاب و متاثراس فلسفی شاعر کا خیال ہے کہ ایرانی تصوف کی اشاعت جو غیر اسلامی عوامل سے متاثر تھا' اسلامی فکر کے جمود کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے کیونکہ اس نے امت مسلمہ سے عمل کا رجحان سلب کرلیا ' اسے صوفیانہ سکر کی طرف دعوت دی اور جسم کو مکروہ اور مادہ کو ناپاک قرار دے کر روح کی طرف متوجہ کیا ۔ اس طرح ایرانی صوفیا کی تحریک ترک عمل ہند میں افراد و جماعت دونوں کے لئے بہت نقصان رساں ثابت ہوئی اس لئے کہ عمل ہی میں قوت حیات ہے اور اس کے ترک میں ذلت و خواری بھی ہے اور ضعف بھی ۔ یہی بات اقبال نے مثنوی اسرار خودی کے دیباچہ میں لکھی ہے ۔

نظریہ' وحدت الوجود کے معنی ہیں ذات کلی یعنی اللہ میں فنا ہوجانا یا بعض غالی صوفیا کے نزدیک ہر شے کا ہر شے میں فنا ہوجانا ۔ اس نظریہ نے اسلام کی فکر آزاد کو جامد کرکے رکھ دیا ۔ سبب ظاہر ہے ۔ قوت حیات

---

۱ ۔ انگریزی خطبات (مطبوعہ لاہور ۱۹۵۱) میں یہ خطبہ صفحہ ۱۲۶ سے شروع ہوتا ہے ۔

عمل میں ہے (فنائیت میں نہیں ہے) ۔ انسان کو چاہئے کہ اپنی ذات کی تربیت و تقویت اور اس پر اعتماد کر کے عمل کے لئے آمادہ ہو نہ کہ زہد و افتادگی کے ذریعہ اس کو ضعیف کرے اور اس کا انکار کرے ۔ یہیں سے ہم اقبال کے کلام اور فلسفے میں ''عنصر خودی'' کا سراغ پاتے ہیں ۔

اقبال کی اردو اور فارسی نظموں کے کئی مجموعے ہیں۔ ان میں پیام مشرق، اسرار خودی ، رموز بےخودی ، جاوید نامہ وغیرہ ہیں ۔ اقبال کا مقصد اپنی اس اصلاحی دعوت کی اشاعت ہے جو جہد پیہم اور عمل مسلسل کے ذریعہ خودی کی جلاء ، تربیت اور تقویت اور مثل اعلیٰ سے عشق کی طرف رہ نمائی کرتی ہے کیونکہ سر ربوبیت خودی کی جلا' میں ہی ہے ۔

خودی کا مفہوم

اقبال نے اسرار خودی کے مقدمہ میں کہ دین بغیر قوت کے محض فلسفہ رہ جاتا ہے یہ سوال اٹھایا ہے کہ خودی کا مفہوم کیا ہے ؟ کیا یہ وہ ذات ہے جو اعمال میں ظاہر ہوتی ہے اور جس کی حقیقت مخفی ہے اور جو ہر مشاہدہ کی تخلیق کرتی ہے ؟ یہ ایک دوامی حقیقت ہے یا فریب خیال؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی ضرورت اور وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ انہوں نے محسوس کیا کہ افراد اور جماعت کی سیرت انا کی معرفت پر موقوف ہے۔

انسان مسلسل بدلتا رہتا ہے ، اس کی حیات نفسی کی کوئی چیز قرار پذیر نہیں ہے بلکہ مسلسل حرکت میں ہے ، حالات نفسیہ کا ایک سیل رواں ہے کہ کہیں ٹھہرتا ہی نہیں ، مگر نقطہ' شعور روشن شاخ در شاخ اور نوع در نوع حالات وجدانیہ کو ایک بنا دیتا ہے اور ماضی کو حال و مستقبل سے مربوط رکھتا ہے ۔

ایک اور مقالہ '' الوھیت اور مفہوم عبادت '' [1] میں اقبال انا کی ایک خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہیں کہ ہر خودی دوسرے سے ممتاز ہے ۔ پھر کہتے ہیں '' میری خوشی ، میرا دکھ ، میرے رجحانات یہ سب میری ملکیت ہیں اور میرے نفس کا جزو لازم ہیں '' (ص-۱۱۴-۱۱۵) ۔

اقبال کا یہ قول بوعلی بن سینا (ف۴۲۸ھ) کی ایک برہان یاد دلاتا ہے ۔ اس برہان کی اساس فکر انا اور وحدت ظواہر نفسیہ ہے جس کو ابن سینا نے وجود نفس و شخصیت کے اثبات کے لئے بیان کیا ہے ۔ اپنی کتاب '' شفا '' اور اسی طرح '' الاشارات والتنبیہات '' میں کہتا ہے :

احوال نفسی ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اور متنوع اشکال اختیار کرتے رہتے ہیں اور مثلاً کبھی ہم خوش ہوتے ہیں کبھی غمگین ، کسی چیز کو پسند کرتے ہیں کسی چیز کو نا پسند، کبھی انکار کرتے ہیں کبھی اقرار ، کبھی چند چیزوں کو

---

۱ - یہ اقتباس اس (تیسرے) خطبے کا نہیں بلکہ چوتھے خطبہ کا ہے ، مگر مقالہ نگار معذور ہیں کیونکہ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں خطبات کے عربی ترجمے میں تیسرے اور چوتھے خطبے کو ایک کردیا گیا ہے ۔

جوڑتے ہیں کبھی ایک چیز کی تحلیل کرتے ہیں - ہم ان سب حالتوں میں ایک شخصیت واحدہ سے کام لیتے ہیں جو مختلف چیزوں میں اتحاد پیدا کرتی ہے اور مرکب کو '' یک جان '' بناتی ہے - اگر یہ قوت نہ ہوتی تو احوال نفس باہم الجھ جاتے ' ان کا نظام برہم ہوجاتا اور اس کے اجزا' ایک دوسرے سے سرکشی اختیار کرتے ،، (البیر نادر: '' ابن سینا و النفس البشریہ -'' ص ۱۷)

اس تفصیل کے باوجود مشکل اب تک حل نہیں ہوئی کہ کونسی چیز اقبال کو طبیعت انا کی بحث کے استقصاء کی طرف لے گئی اور اس نے علماء دین اور بعض ماہرین فلسفۂ جدید کے نظریات کو پیش کرتے ہوئے بیان کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ خودی کوئی شے نہیں بلکہ عمل ہے اور تجربۂ انسانی سلسلہ ہے ایسے افعال و اعمال کا جن میں سے ہر ایک دوسرے سے مربوط ہے اور ان کا یہ ربط باہم ایک رہ نما مقصد کی وجہ سے ہے -

(تجدد التفکیر الدینی فی الاسلام' ص ۱۱۷)

اپنے خطبات کی طرح '' اسرار خودی '' میں بھی اقبال نے اس نظریۂ خودی کو پیش کیا اور اس پر گفتگو کی ہے اور یہ ثابت کرنے کے بعد کہ حیات خودی کا منشا عمل و فعل ہے اور یہ کہ جسم بھی حوادث و افعال کے نظام کا نام ہے' اقبال نے موضوع خودی پر اقوام مشرق و مغرب کی ذہنیتوں کا موازنہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ اقوام مشرق انا کو انسان میں فریب خیال سمجھتی ہیں اور اس سے رہائی کو نجات قرار دیتی ہیں - اقبال نے اگر ایک موقعہ پر علماء ہنود کی اس رائے کو کہ وہ حیات انا کا منشاء عمل کو سمجھتے ہیں' فلسفیانہ نقطۂ نظر سے قابل قدر سمجھا ہے تو دوسرے موقعے پر ان پر اعتراض بھی کیا ہے کہ انہوں نے بجائے اس کے کہ تقویت ذات کی کوشش کرتے ' اس بات کی دعوت دی کہ صوفیانہ جذبے میں فعل سے بے نیاز ہوجاؤ اور کہا کہ انا کے جال سے رہائی کی ترک عمل کے سوا کوئی سبیل نہیں ہے - حال آں کہ ترک عمل میں افراد و جماعات کی زندگی کے لئے بڑا خطرہ ہے اس لئے کہ بقول اقبال '' عمل میں قوت حیات ہے '' اور حقیقی اسلام کی روح سے وابستگی !

اسلام کا پیغام ایک پر زور دعوت عمل ہے اور انا مذہب اسلام میں مخلوق ہے جو عمل کے ذریعہ خلود و دوام حاصل کرتی ہے - یہ فکر اقبال کی روح پر چھائی ہوئی ہے جس کو ہم اس کی مثنویوں اسرار خودی اور رموز بے خودی میں دیکھتے ہیں اور اس کے دوسرے مجموعہائے کلام میں بھی جیسے جاوید نامہ جسے اقبال نے اپنے صاحبزادہ جاوید کے نام سے معنون کیا ہے اور پیام مشرق اور تجدید التفکیر الدینی فی الاسلام (مجموعۂ خطبات) - مزید اطمینان کے لئے خود ان کا قول سنئے - اپنے خطبے '' الوھیت اور مفہوم عبادت '' میں فرماتے ہیں :

'' نفس کو مزکیٰ اور فساد سے پاک کیوں کر رکھا جاسکتا ہے؟ یہ صرف عمل ہی کے ذریعے ممکن ہے - اللہ تعالیٰ سورۂ الملک میں فرماتا ہے :

تبارک الذی بیدہ الملک وھو علی کل شیٔ قدیر ہ الذی خلق الموت

والحیواۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً وھو العزیز الغفورہ

(بڑی با برکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں حکومت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، جس نے موت اور زندگی بنائی تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں کون اچھا کام کرتا ہے، اور وہ زبردست ہے بخشنے والا) -

گویا زندگی کو عمل خودی کے لئے بہت سے مواقع حاصل ہوتے ہیں اور موت پہلی آزمائش ہے کہ وہ دیکھے کہ اپنے اعمال کی شیرازہ بندی میں کتنی کامیابی ہوئی ؟ اعمال نہ لذت بخشتے ہیں نہ الم پیدا کرتے ہیں بلکہ وہ یا تو خودی کی بقا کا سامان فراہم کرتے ہیں یا اسے فنا کردیتے ہیں - بقا سامان عمل کا اصول یہ ہے کہ میں اپنی اور دوسرے انسانوں کی خودی کا احترام کروں اور اسی لئے خلود اور دوام ہمارا حق نہیں ہے بلکہ اس کا حصول ہماری سعی وجہد پر موقوف ہے اور انسان اس کا امیدوار ہے - ''

(تجدید التفکیر الدینی فی الاسلام ص ۱۳۷)

اب آپ پر واضح ہوگیا کہ اقبال کا فلسفہ حرکی ہے جو سعی مسلسل اور عمل پیہم کے اصول پر قائم ہے - یہ اشعار و افکار اقبال کے محققین کا فیصلہ ہے، جیسے کہ ڈاکٹر عبدالوھاب عزام بے نے اپنی کتاب '' محمد اقبال — سیرتہ و فلسفہ و شعرہ '' میں لکھا ہے -

موضوع خودی اقبال کے فلسفے اور شاعری پر حاوی رہا ہے بالخصوص مثنوی اسرار خودی اور مثنوی رموز بے خودی میں - ان دونوں مثنویوں میں فلسفہ بھی ہے اور اس کی دل آویز غنائیت بھی - اس موضوع کی خشکی کو اقبال کے شاعرانہ خیالات نے ختم کردیا ہے — تو خودی جیسا کہ ابھی ہم نے عرض کیا اپنے جوھر میں عمل پیہم اور جہد مسلسل ہے - اسرار خودی کے مقدمے میں شاعر ہمیں خودی کے غلط مفہوم سے بچانا چاہتا ہے چنانچہ وہ اس کتاب میں خودی کو خود پرستی اور خود پسندی کے مفہوم میں استعمال نہیں کرتا جیسا کہ شاید اردو میں اس کا مفہوم ہے، بلکہ وہ تعین ذات اور عرفان ذات کے مفہوم میں اس لفظ کو استعمال کرتا ہے - اس طرح بے خودی سے اس کا مفہوم '' لا ذات '' ہے یعنی اجتماعیت ' جیسا مثنوی رموز بے خودی میں ہے - انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی خودی کی تربیت کرکے اپنی انسانیت کی تکمیل کی سعی کرے - کوہ ہالہ دریائے گنگا سے کہتا ہے :

زندگی ہرجائے خود بالیدن ست از خیابان خودی گل چیدنا ست

اسی طرح اقبال نے انکار خودی کی بنا پر صوفیا کی مخالفت کی ہے - نیز جذب و وحدت الوجود کا قائل ہونے کی وجہ سے بھی وہ ان کا مخالف ہے اور ان دونوں عقیدوں پر مشتمل تصوف کو وہ '' غیر اسلامی تصوف '' کہتا ہے -

اقبال نفی و انکار خودی کو زوال پذیر و شکست خوردہ اقوام کی اختراع کہتا ہے - ایک حکایت بیان کرتا ہے کہ ایک بھیڑوں کا گلہ تھا جس پر شیروں کا قبضہ ہوگیا تو ایک چالاک بھیڑ نے اپنے مغلوب گلے کو غالب درندوں کے دانتوں سے بچانے اور درندوں کا اقتدار ختم کرنے کی ایک تدبیر سوچی-

اس بھیڑ نے دعویٰ کیا کہ وہ نبی ہے جسے شیروں کی طرف بھیجا گیا ہے ۔ اس بھیڑ نے نفی خودی کی خوبیاں بیان کیں اور شیر کو زہد و قناعت کی دعوت دی اور بتایا کہ قوت تو کھلی کھلی ناکامی ہے ۔ اب آپ سنئے ، اقبال شیر پر اس بھیڑ کی تبلیغ کا اثر دکھاتا ہے :

خیل شیر از سخت کوشی خستہ بود — دل بذوق تن پرستی بستہ بود
آمدش این پند خواب آور پسند — خورد از خامی فسون گوسفند
با پلنگان سازگار آمد علف — گشت آخر گوہر شیری خزف
از علف آں تیزی دندان نماند — ہیبت چشم شرر افشاں نماند
دل بتدریج از میان سینہ رفت — جوہر آئینہ از آئینہ رفت
آں جنون کوشش کامل نماند — آں تقاضائے عمل در دل نماند
اقتدار و عزم و استقلال رفت — اعتبار و عزت و اقبال رفت
پنجہ ہائے آہنیں بے زور شد — مردہ شد دلہا و تنہا گور شد
زور تن کاہید خوف جان فزود — خوف جان سرمایہ ٔ ہمت ربود
صد مرض پیدا شد از بے ہمتی — کوتہ دستی ، بے دلی ، دون فطرتی

شیر بیدار از فسون میش خفت
انحطاط خویش را تہذیب گفت

دیکھا آپ نے اقبال ان اشعار میں اپنی شیر صفت قوم کی درماندگی اور پست ہمتی کا سبب اس برطانوی استعمار کی سازش کو ٹھہراتا ہے جس کا شکار ہو کر اس قوم میں انکار خودی کا رجحان پیدا ہو گیا ، برطانیہ کا مقصد اس قوم کو مسخ کر دینا اور بدل ڈالنا تھا ۔

یقیناً شخصیت کی جلاء و ترقی اور تربیت خودی میں بہتر اور اعلیٰ زندگی کی ضمانت ہے ۔ اقبال کا خیال ہے کہ نباتات ، حیوانات اور انسانوں میں سے ہر وجود کے لئے ایک خودی ہوتی ہے جو اپنے درجہ ٔ ارتقا کے لحاظ سے کائنات میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے اور اس کا ارتقا ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ہوتا رہتا ہے ۔ چنانچہ وہ اپنے مقالے '' اسلامی تمدن کی روح '' میں جو ان کے مجموعہ خطبات میں شامل ہے ، ابن مسکویہ (ف ۴۲۱ھ) کے قول کی سند پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ نظریہ ٔ ارتقا فکر اسلامی کی بنیادوں میں سے ہے اور زندہ موجودات برابر بڑھتے رہتے ہیں اور اعلیٰ مدارج تک پہنچ جاتے ہیں ۔ ابن مسکویہ کہتا ہے :

نباتات اپنے ارتقا کے ابتدائی درجے میں تخم اور کاشت کے بغیر ہی پھوٹتے ہیں اور بقا نوع کے لئے پھل اور تخم سے کام نہیں لیتے ۔ ان کی پیدائش کے لئے صرف امتزاج عناصر ، ہوائیں اور دھوپ کافی ہوتی ہے اور اس لئے وہ اس مرحلے میں جمادات سے قریب ہوتے ہیں ۔ جمادات پر نباتات کو حرکت اور نمو کی معمولی سی فضیلت حاصل ہوتی ہے کہ ان سے شاخیں پھوٹتی ہیں اور یہ تخم کے ذریعے اپنی نوع کا تحفظ کرتے ہیں ۔ پھر یہ فضیلت بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ درخت بن جاتے ہیں جن میں تنے ، پتے اور پھل پیدا ہوتے ہیں ۔ ارتقا

کے اس سے اونچے درجے میں اپنی نشو و نما کے لئے مناسب آب و ہوا اور موزوں زمین کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس طرح نوع نباتات ترقی کرتی رہتی ہے اور اس کے افراد ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کا اعلیٰ نمونہ انگور اور خرما کی شکل میں نمودار ہوتا ہے ۔ یہ وہ مرحلہ ہے جو حیوانات کے مرحلے سے قریب ہوتا ہے ۔ خرما کے درخت میں تو نر اور مادہ کے درمیان نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے ۔ پھر یہ درخت ارتقا کے ایسے مرتبے پر پہنچ جاتا ہے کہ اس میں جڑ اور ریشوں کے علاوہ ایسی چیزیں بھی نمودار ہوتی ہیں جو حیوانی دماغ سے مشابہ ہوتی ہیں ۔انہیں چیزوں کی سلامتی پر درخت خرما کی بقا کا انحصار ہوتا ہے ۔ یہ نباتات کا سب سے اونچا درجہ ہوتا ہے اور حیوانات سے قریب تر ، بلکہ اس مرحلے میں نباتات اور حیوانات میں صرف ایک فرق رہ جاتا ہے اور وہ ہے زمین سے اوپر اٹھ سکنا ۔ یہ شعوری حرکت کا آغاز ہوتا ہے اور حیوانیت کا پہلا درجہ ہے۔ اس درجے میں سب سے پہلے حس لامسہ حاصل ہوتی ہے اور سب سے آخر میں حس بصر ۔ جب حواس ترقی کرنے لگتے ہیں تو حرکت پر قدرت بھی حاصل ہوجاتی ہے جیسے کیڑے مکوڑے، چیونٹی اور شہد کی مکھی ۔ کمال حیوانیت کا مظہر چرند اور پرند میں گھوڑا اور عقاب ہوتے ہیں ۔ حیوانیت اس طرح درجہ بدرجہ بالاتر ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ بندر کی شکل میں وہ انسانیت سے قریب تر ہوجاتی ہے ۔ بندر حیوانیت کا وہ انتہائی درجہ ہے کہ حیوان اس سے تجاوز کرے اور تھوڑا سا آگے بڑھے تو حیوانیت کی حدود کو طے کرکے انسانیت کے مرتبے تک پہنچ جائے ۔ گویا بندر نشو و نما میں انسان سے معاً بعد والے درجے میں ہے اور اس کے بعد جو نشو و نما ہوتی ہے اس میں عضوی تغیرات رونما ہوتے ہیں اور قوت تمیز و عقل اور قوت روحانی ترقی کرنے لگتی ہے ۔بڑھتے بڑھتے انسانیت وحشت سے تہذیب و تمدن کی منزل تک آ پہنچتی ہے ۔'' (تجدید التفکیر الدینی فی الاسلام، ص ۱۵۴-۱۵۵)

جیسا کہ ابن مسکویہ نے ذکر کیا اور اقبال نے اس کی تائید کی ، ذات و حیات کا ارتقا عام ہے ۔ انسان اپنے جسمانی و روحانی دونوں پہلوؤں سے ایک مستقل مرکز حیات ہے لیکن وہ اب تک فرد کامل کے درجے تک نہیں پہنچا ، یہ درجہ اللہ سے زیادہ قریب ہے اور اقبال ہمیں اس قرب کے غلط مفہوم سے بچانا چاہتا ہے کیونکہ تقرب الٰہی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان اپنے وجود کو اللہ کے وجود میں فنا کر دے جیسا کہ غالی صوفیا کا مسلک ہے ۔ اس چیز کو اقبال نے اپنے خط میں ثابت کیا ہے جو اس نے نکلسن مترجم اسرار خودی کے نام لکھا تھا ۔ اس خط میں اقبال نے اپنے فلسفے کی تشریح کی تھی ۔

انسان کے کمال اور حریت تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مادہ پر اقتدار حاصل کرے یعنی نیچر پر، چنانچہ ہمارا فلسفی شاعر اپنے مقدمہ اسرارخودی (انگریزی) میں جو اس نے مثنوی کی طباعت اولیٰ پر لکھا تھا ، کہتا ہے :

'' زندگی مسلسل ارتقا ہے ... . اس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ یعنی نیچر ہے لیکن مادہ شر نہیں ہے کیونکہ وہ خودی کو اپنی پوشیدہ

قوتیں اجاگر کرکے کام میں لانے کے قابل بناتا ہے - جب خودی تمام مشکلات راہ پر قابو پالیتی ہے تو وہ اختیار کے مرتبہ پر پہنچ جاتی ہے -

خودی میں اختیار بھی ہے اور جبر بھی اور جب وہ اس فرد کے قرب کو پالیتی ہے جسکو حریت مطلقہ حاصل ہے یعنی اللہ تعالیٰ تو خود بھی کمال حریت پر فائز ہوجاتی ہے - اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو زندگی حصول اختیار کی جدوجہد کا نام ہے -''

اور سنئیے ، اقبال ایک نظم '' حور و شاعر '' میں جرمن شاعر گوئٹے سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے آرزوئے پیہم ، جہد پیہم اور سفر پیہم کا بیان کرتا ہے :

چہ کنم کہ فطرت من بہ مقام در نسازد
دل نا صبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوب روئے
تپد آن زمان دل من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
چو ز بادۂ بہارے قدمے کشیدہ خیزم
غزلے دگر سرایم بہ ہوائے نو بہارے
طلبم نہایت آن کہ نہایتے ندارد
بہ نگاہ نا شکیبے بہ دل امید وارے

ان مضامین کو شاعر نے صدہا پیرایوں میں، مختلف مواقع پر نظم کیا ہے - ذرا بتائیے کیا آپ کسی ایسے شاعر کو جانتے ہیں جو سعی و عمل کی زندگی کی نغمہ سرائی کرتا ہو اور کیا آپ کسی ایسے فلسفی سے واقف ہیں جس نے اس موضوع پر اتنی تفصیل و تشریح کی ہو اور اس زور بیان و قوت کلام کے ساتھ اس سلسلے میں شکوک کو رفع کیا ہو ، پھر ایسے سحرکارانہ انداز بیان کے ساتھ!

خودی یا شخصیت اقبال کے فلسفہ حرکی کا محور ہے- اقبال کے نظام فکر میں خودی کی اہمیت کو بیان کرنے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ اسے معیار خیر و شر سمجھتے ہیں- اسرار خودی کے انگریزی مقدمہ میں کہتے ہیں '' جو چیز خودی کو قوی کرتی ہے وہ خیر ب اور جو چیز اسے ضعیف کرتی ہے وہ شر ہے اور دین ، اخلاق اور فنون سب کا اس معیار پر قائم ہونا ضروری ہے ''-

جہاد خودی کا ہتھیار عشق ہے - اقبال کے فلسفے میں عشق کا مفہوم بہت وسیع ہے - وہ حیات بھی ہے اور شعلۂ حیات بھی ، وہ تخلیق مقاصد اور حصول مقاصد پر ابھارنے والی قوت ہے — عشق کے ذریعے اور عشق مثل اعلیٰ کے ذریعے— اور مثل اعلیٰ سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے — خودی کی تمام پنہاں صلاحیتیں جلوہ گر ہو جاتی ہیں - جب انسان عشق میں پختہ ہوجاتا ہے تو اس پر مشکلات آسان ہو جاتی ہیں،

دشواریاں سہل ہوجاتی ہیں، قوائے عالم مسخر ہو جاتے ہیں اور حقیقت وجود کا ادراک حاصل ہوجاتا ہے ۔ ملاحظہ ہو صوفی شاعر اقبال ، عشق کی شان میں یوں زمزمہ سنج ہے :

نقطۂ نورے کہ نام او خودی ست — زیر خاک ما شرار زندگی ست
از محبت می شود پائندہ تر — زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر
از محبت اشتعال جوہرش — ارتقائے ممکنات مضمرش
عشق را از تیغ و خنجر باک نیست — اصل عشق از آب و باد و خاک نیست
در جہان ہم صلح ہم پیکار عشق — آب حیواں تیغ جوہر دار عشق

آتش بجاں شاعر عشق کے ذریعے اعلیٰ درجات تک پہنچا اور اس پر اسرار وجود آشکار ہوگئے ۔ اس نے کلام میں بار بار کہا ہے کہ وہ حقیقت کا رازداں ہے ، وہ مطلع عالم پر ایک آفتاب تازہ بن کر طلوع ہوا ہے تاکہ پردۂ ظلمت کو چاک کر دے ۔ اسرار خودی کی تمہید منظوم میں اس کے ساحرانہ نغمات سنئے :

در جہاں خورشید نوزائیدہ ام — رسم و آئین فلک نادیدہ ام
بامم از خاور رسید و شب شکست — شبنم نو بر گل عالم نشست
انتظار صبح خیزاں می کشم — اے خوشا زرتشتیان آتشم
نغمہ ام از زخمہ بے پروا ستم — من نوائے شاعر فردا ستم
نغمۂ من از جہان دیگر ست — این جرس را کاروان دیگر ست
اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد — چشم خود بر بست و چشم ما کشاد
نغمہ ام ز اندازۂ تار ست بیش — من نترسم از شکست عود خویش
قطرہ از سیلاب من بیگانہ بہ — قلزم از آشوب او دیوانہ بہ
بر قہا خوابیدہ در جان من ست — کوہ و صحرا باب جولان من ست
پنجہ کن با بحرم از صحراستی — برق من در گیر اگر سیناستی
چشمۂ حیواں براتم کردہ اند — محرم راز حیاتم کردہ اند
ذرہ از سوز نوایم زندہ گشت — پر کشود و کرمک تابندہ گشت

درحقیقت اقبال کا کلام پر سوز و حرارت انگیز ہے جو مجاہد قوموں میں نور اور نار دونوں پیدا کرتا ہے ۔ اسی طرح اس کا فلسفہ حرکی ہے اس لئے کہ وہ مغلوب اقوام کے قلوب میں شعاع آرزو پیدا کرتا ہے اور انہیں عمل پر ابھارتا ہے ۔ اقبال نے اپنے کلام اور فلسفہ میں وسیع انسانی افق کو اپنی منزل مقصود قرار دیا ہے ۔ اگرچہ اس نے مسلمانان ہند کو اپنے خطاب کے لئے مختص کردیا اور اس میں شک نہیں کہ اس کے کلام نے ان کے دلوں میں انگریزی اقتدار کے خلاف ایک باغیانہ رجحان پیدا کردیا اور مجاہدین آزادی کو امید، عزم اور صبر مسلسل کا سبق دیا ۔

کیا اقبال کے لئے یہ فخر کم ہے کہ اس کے لئے بانیٔ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے فرمایا تھا : ''اقبال میرا دوست تھا، راہبر تھا، فلسفی تھا ۔'' آپ نے فیصلہ کرلیا ہوگا کہ اقبال کا فلسفہ تمام کا تمام ارتقائے انسانی

کی سعیٔ پیہم کا فلسفہ ہے تاکہ وہ کمال انسانیت کے درجہ تک پہنچ سکے۔ اقبال تربیت خودی کے تین مرحلے بتاتا ہے :

(۱) طاعت (۲) ضبط نفس (۳) نیابت الہی ۔طاعت کا مطلب ہے بجبر نہیں بلکہ بخوشی پابندیٔ شریعت تاکہ تسخیر کائنات ممکن ہو۔ کہتے ہیں :

ناکس از فرمان پذیری کس شود　　آتش ار باشد ز طغیان خس شود
ہر کہ تسخیر مہ و پروین کند　　خویش را زنجیری آئین کند

ضبط نفس، خوف، ہرخواہش اور طمع ختم کئے بغیر ممکن نہیں ہے ۔ جو اپنے نفس پر غالب نہ آسکا وہ اس لائق ہے کہ دوسرا اس پر غالب و حاوی ہوجائے ۔ نیابت الہی، ارتقائے انسانی کا اعلیٰ درجہ ہے ۔نائب حق زمین پر اللہ کا خلیفہ ہوتا ہے اور اس مرحلہ میں انسان مادہ اور قوائے عالم پرحکم راں ہوتا ہے مصلح و معمار بن کر! اقبال انگریزی مقدمۂ اسرار خودی میں اس نائب کے صفات اس طرح بیان کرتے ہیں :

وہ فرد کامل ہوتا ہے ' انسانیت کا مقصود ہوتا ہے ۔ نائب حق کی ذات میں نفس کے متضاد عناصر آکر مل جاتے ہیں جن میں بہترین قویٰ اور بہترین اعمال وحدت پیدا کردیتے ہیں ۔ پھر اس میں ذکر و فکر ' خیال و عمل اور عقل اور خصائص جبلی ایک ہوجاتے ہین ۔ شجر انسانیت کا ثمر آخریں اور ارتقائے حیات شدائد و صعوبات کا جواز صرف یہ ہے کہ اسکو ظہور میں آنا ہے۔ وہ بنی نوع انسان کا اصلی حاکم ہوتا ہے۔ ہمارا جتنا زیادہ ارتقاء ہوتا ہے اتناہی ہم اس (مقصود) سے قریب ہوتے ہیں۔ اس تک، قریب ہونے میں ہم در اصل خود بھی پیمانہ حیات کے بلند درجات حاصل کرتے ہیں ۔ اس لئے کہ اس کی حکومت در حقیقت خدا کی حکومت ہوتی ہے ...

نائب حق کے ظہور کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ انسانیت اپنے جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے ترقی کرے، اس لئے کہ انسانیت کا ارتقا ایک ایسی مثالی امت کے ظہور کا مقتضی ہوتا ہے جس کے اکثر افراد میں خودی کی (مندرجہ بالا) وحدت جلوہ گر ہو اور اس طرح وہ نائب حق کے ظہور کا استحقاق پیدا کر لیتی ہے ۔

زمین پر اللہ کی حکومت کے معنی ہیں کہ اس پر ایک ایسی شورائی جماعت ہو جس کے ارکان و افراد باہم یک جاں ہوں اور اس جماعت کا ایک فرد سربراہ ہو جس کو نائب حق اور انسان کامل کہا جاسکے ۔ یہ انسان کامل مرتبۂ کمال کی ان بلندیوں تک پہنچ جائے جن سے بالاتر مرتبے کا تصور بھی نہ کیا جا سکے '' (عبدالوہاب عزام : '' محمد اقبال '' ۔ ص ۶۰) ۔

قابل غور بات یہ ہے کہ اقبال کا '' نائب حق '' محی الدین ابن عربی اور غالی صوفیا کے انسان کامل سے مختلف ہے' اس لئے کہ یہ لوگ اقبال کی نظر میں علم برداران سکون و سکر اور منکران خودی ہیں اور ان کے نزدیک انسان کامل وہ ہے جس نے اپنی ذات کو خدا کی ذات میں فنا کردیا ہو اور حلول کے اس درجہ تک پہنچ گیا ہو جس کا ذکر شہید صوفیا حلاج نے اپنے اس شعر میں کیا ہے۔

انا من اهوی ومن اهوي انا　　نحن روحان و حللنا بدنا

(میں وہ ہوں جس سے میں محبت کرتا ہوں اور جس سے میں محبت کرتا ہوں وہ میں ہوں - ہم دو روحیں ہیں جو ایک بدن میں حلول کر گئی ہیں)۔

اور اس کے مشہور نعرہ انا الحق اور اس کے اس قول "لیس فی ثوبی الا اللہ" (میرے لباس میں اللہ ہی تو ہے) میں بھی اس درجہ حلول کا ذکر ہے - بایزید بسطامی نے حالت جذب میں کہا تھا: سبحانی ما اعظم شانی (پاک ہے میری ذات، کتنی بڑی ہے میری شان) - اقبال نے نظریہ فنائے ذات یعنی عقیدہ وحدت الوجود کی تردید و تغلیط کی ہے اور شخصیت کے استحکام کی دعوت دی ہے -

خودی سے اقبال کی مراد خود پرستی و خود بینی نہیں کیونکہ بقول اقبال خودی صرف جماعت ہی میں تربیت پاتی ہے، نمایاں ہوتی ہے اور کمال کو پہنچتی ہے اور یوں فرد اور اس کی جماعت کا ربط واضح و محقق ہے - چنانچہ اقبال مثنوی رموز بے خودی میں کہتا ہے:

فرد تا اندر جماعت گم شود　　قطرہ وسعت طلب قلزم شود
مایہ دار سیرت دیرینہ او　　رفتہ و دیرینہ را آئینہ او
وصل استقبال و ماضی ذات او　　چوں ابد لا انتہا اوقات او
در دلش ذوق نمو از مات است　　احتساب کار او از ملت است
پیکرش از قوم وہم جانش ز قوم　　ظاہرش از قوم و پنہانش ز قوم

جب جماعت غافل ہوجاتی ہے اس میں عزیمت کند ہوجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں ایک ہادی مبعوث فرماتا ہے۔ اقبال اس ہادی کے اوصاف یوں بیان کرتا ہے:

ساز پردازے کہ از آوازہ　　خاک را بخشد حیات تازہ
زندہ از یک دم دو صد پیکر کند　　محفلے رنگین ز یک ساغر کند
دیدہ او می کشد لب جاں دمد　　تا دوئی میرد یکے پیدا شود
از تف او ملتے مثل سپند　　بر جہد شور افگن و ہنگامہ بند
یک شرر می افگند اندر دلش　　شعلہ در گیر می گردد گلش

اقبال انسان کامل کو خوش آمدید کہتا ہے:

شورش اقوام را خاموش کن　　نغمہ خود را بہشت نوش کن
خیز و قانون اخوت ساز دہ　　جام صہبائے محبت باز دہ
باز در عالم بیار ایام صلح　　جنگ جویان را بدہ پیغام صلح
نوع انسان مزرع تو حاصلی　　کاروان زندگی را منزلی
ریخت از جور خزاں برگ شجر　　چوں بہاراں بر ریاض ما گذر

کہیں وہ انسان کامل خود اقبال تو نہیں ہے؟ ہاں، یہ انسان کامل اور ہادی آتا ہے اور اپنی قوم کے قلوب اوہام و شکوک سے آزاد کراتا ہے اور ان میں عزیمت کی روح پھونکتا ہے، ان کے طوق اتار پھینکتا ہے اور ان کی جانوں کو اللہ کے لئے آزاد کراتا ہے -

اقبال کا ''نائب حق'' ہمیں نیطشے کے انسان کامل کی یاد دلاتا ہے۔ نیطشے نے اس انسان کامل اور اس کی امت کاملہ کا ذکر اپنی کتاب '' زرتشت کہتا ہے'' میں کیا ہے۔ اقبال بھی اس الحانوی فلسفی سے اپنی اثر پذیری کو چھپاتا نہیں ، لیکن مقدمہ' اسرار خودی میں اس کی دھریت کو ہدف تنقید بناتا ہے۔ '' نیطشے کو اس مثالی قوم کے ظہور کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن اس کی دھریت اور اقتدار کی ہوس نے اس کے فلسفے کو مسخ کر ڈالا ''۔

جب انسان کا ارادہ ہو کہ زندگی پر خوب خوب اثر انداز ہو اور فطرت پر اقتدار کامل حاصل کرے اور کوئی کارنامہ انجام دے تو اقبال کے نزدیک اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ سب سے پہلے اپنے میں تبدیلی پیدا کرے اور اپنی خودی کو بلند کرے۔ اس بنیاد پر حقیقی فنکار وہ ہے جو تقلید سے گریز کرے اور اللہ کے اخلاق سے متصف ہو جائے۔ اب دیکھئے اقبال جو خود انسان کامل اور تخلیقی فنکار کی علامت ہے '' پیام مشرق '' میں اللہ کے سامنے کھڑا ہوکر اور اسے مخاطب کرکے بتاتا ہے جب اسے خلیفہ بنایا گیا تو اس نے زمین پر کیا کیا کیا؟

تو شب آفریدی ، چراغ آفریدم — سفال آفریدی ، ایاغ آفریدم
بیابان وکہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اقبال کے لئے اس کے تعمیری اور حرکی فلسفے' اس کی پاکیزہ صوفیانہ روح اور اس کی زندگی دوستی کی بنا' پر یہ سہل ہوگیا کہ وہ مشرق و مغربی اقدار میں بہترین رابطہ پیدا کرے اس لئے کہ اقبال مغربی ثقافت کے سر چشمے سے بھی سیراب ہوا تھا اور اس نے برگساں کے حرکی فلسفہ کو قبول کیا تھا اور نیطشے اور گوئٹے وغیرہ جیسے کئی فلاسفہ سے متاثر ہوا تھا۔ اس نے اسلامی فکر و حیات کی تاریخ کو خوب سمجھا تھا اور اس بحر بیکراں سے اس نے ایک مستحکم نظام فلسفہ تیار کیا تھا جو اس کا اپنا نظام اور ایک نیا مکتب فکر تھا۔

اقبال ایک پیش بین شاعر تھے۔ انہوں نے مسلمانان ہند کو ایک روشن مستقبل کی خبر اور نئی سحر کا مژدہ سنایا تھا ، چنانچہ انہوں نے اپنے اصلاحی پیغام کا نغمہ الاپا اور اپنے اشعار میں بار بار یہ بتایا کہ میں ایک آفتاب تازہ ہوں جو کائنات پر طلوع ہوا ہے اور جو نور و ہدایت پھیلائے گا۔ آئیے میرے ساتھ گنگنائیے :

در جہان خورشید نو زائیدہ ام — رسم و آئین فلک نادیدہ ام
رم ندیدہ انجم از تابم ہنوز — ہست نا آشفتہ سیمابم ہنوز
بامم ازخاور رسیدوشب شکست — شبنم نو بر گل عالم نشست
انتظار صبح خیزاں می کشم — اے خوشا زرتشتیان آتشم

واقعہ یہ ہے کہ وہ صبح نو تھی جو مسلمانان ہند کی شب ہائے تیرہ و تار میں ضوفشاں ہوئی تھی۔ اس نے صعوبت سفر برداشت کی اور مسلمانوں کے دلوں میں فرنگی اقتدار کے خلاف شعلہ' حریت فروزاں کیا اور ان کے دلوں میں

ایک اسلامی حکومت کی تڑپ پیدا کردی۔ اقبال نے ۱۹۳۷ میں صدر مسلم لیگ محمد علی جناح کو لکھا تھا ''موجودہ حالات میں بہتری کی واحد شکل یہ ہے کہ نسلی، دینی اور لسانی بنیادوں پر ہندوستان کو تقسیم کر دیا جائے''۔

لیکن یہ پیشین گوئی کرنے والا شاعر قیام پاکستان سے ۹ سال قبل چل بسا اور موت نے اسے یہ موقع نہ دیا کہ اپنی بشارت کو پورا ہوتے دیکھ کر خوش ہوتا۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ وہ الہامی شاعر تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی چشم باطن سے اس چیز کو دیکھ لیا تھا جو پردۂ روزگار پر موجود ہے مگر چشم ظاہر سے مخفی ہے۔ ہاں اقبال نے ایک آزاد مسلم پاکستانی قوم کو اس کے ظہور سے کئی سال پہلے دیکھ لیا تھا اور سرشار ہو کر نغمہ سرا ہوا تھا:

من کہ ایں شب را چو مہ آرا ستم — گرد پائے مات بیضا ستم
ملتے در باغ و راغ آوازہ اش — آتش دلہا سرود تازہ اش
ذرہ کشت و آفتاب انبار کرد — خرمن از صد رومی و عطار کرد

یہ چند اشارے تھے اقبال کے حرکی فلسفے اور ان کے کلام کے متعلق۔ یہاں میں نے ان کے پورے مسلک کے احاطہ کی کوشش نہیں کی اور نہ مجھے اس کا دعویٰ ہے۔ بہر حال ان اشاروں سے اس ملی فلسفی اور شاعر پاکستان کی ندرت ظاہر ہو گئی ہوگی جو انسان کے ارتقا اور زندگی پر یقین رکھتا تھا اور جو عہد زوال و جمود کے ان بعض مسلمان مفکرین کے اس نظریہ کا مخالف تھا کہ اسلام ''غریب'' آیا تھا اور عن قریب پھر ''غریب'' ہی ہو جائے گا کیونکہ اس طرح ان مفکرین نے انسان کے خوب سے خوب تر کی طرف ارتقا کو روک دیا تھا اور فکر کو جامد اور عقیدے کو سنگ بستہ کر دیا تھا۔ مزید برآں اقبال عصر نو کے مفکرین و مصلحین سے اس باب میں ممتاز تھا کہ اس نے اپنی اصلاحی دعوت ایک نظام فلسفہ پر رکھی۔ یہی ان کا راز ندرت اور ما بہ الامتیاز وصف ہے۔ دوسرے مصلحین عصر کی طرح اقبال نے بھی اسلام کے دفاع کا موقف اختیار کیا مگر یہ دفاع ایک ایسا شخص کر رہا تھا جو ذکی تھا، روح اسلام کا رازداں تھا اور اعتدال پسندانہ صوفیانہ تجربے میں اس نے اپنی زندگی گذاری تھی۔ فلسفی ہونے کے باوجود اس کے لئے یہ سہل و ممکن ہو گیا کہ مختلف نظریات کو ایک باقاعدہ مکتب فکر کے طور پر ترتیب دے۔ سحر کار اور بلند پرواز اقبال امر ہے!

ترجمہ از حکیم محمود احمد برکاتی

المراجع

1) محمد اقبال (تجديد التفكير الديني في الاسلام) ترجمة عباس محمود العقاد ط . القاهرة 1955 .

2) Mohamed Igbal (Reconstruire la Pensee Religieuse de l'Islam) Traduction et Notes de Eva Meyerovitch. Preface de Louis Massignon. Ed. Librairie d'Amerique et d'Orient. Adrien-Maisonneuve, Paris 1955.

3) محمد اقبال (پيام مشرق) رسالة المشرق — ديوان شعر — ترجمة الدكتور عبد الوهاب عزام . مجلس اقبال — كراشي — باكستان .

4) Mohamed Igbal (Message de l'Orient) Traduction de Eva Meyerovitch et Mohamed Achena. Introduction d'Eva Meyrovitch.

5) الدكتور عبدالوهاب عزام (محمد اقبال — سيرته و فلسفته و شعره . مطبوعات باكستان .

6) H.A.R. GIBB (Les Tendances Modernes de l'Islam) traduction par Bernard Vernier, Paris 1949.

7) Henri Laoust (Le Reformisme Orthodoxe de la Selefia) in Revue des Etudes Islamiques, Paris 1932.

8) Henri Lammens (La Crise interieure de l'Islam) in Etude, pp. 129 - 146, Paris 1926.

9) Roger Le Tourneau (L'Islam Contemporain), Paris 1956.

10) Henri Bergson (L'Evolution Creatrice), P. U. F.

11) Henri Bergson (La Pensee et le mouvant), P. U. F.

12) Luce - Claude Maitre (Un grand humaniste Oriental) in Revue (Orient) n° 13, le trim. 1960.

13) Pierre Meile (Causerie sur Igbal) extrait.

14) Nietzsche (Ainsi Parlait Zarathoustra) Trad. Maurice Betz, Ed. Gallimard, Paris 1947.

15) Andre Guimbretiere (Une dynamique de l'Eau et du Feu) extrait

(16) Eva Meyerovitch (le Poete et le Philosophe) extrait - Publication du Service de Presse Ambassade du Pakistan a Paris.

17) احمد امين (زعماء الاصلاح) ط . القاهرة 1948 .

18) عباس محمود العقـــاد (الاسلام فى القرن العشرين — حاضره و مستقبله) .

19) الشيـــخ مصطفى الغلاييني (الاســـلام روح المدنية) ط . بيروت 1348هـ / 1930 م .

20) معروف الرصافى — سلسلة شعراؤنا . دار صادر بيروت 1960

21) البير نادر (ابن سينا و النفس البشرية) ط . بيروت 1960

* * *

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006